

مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی

(۲)

سعید احمد اکبر آبادی

وقت گزرنے کے ساتھ بے تکلفی بڑھتی رہی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے کہ میں مفتی صاحب کے خاندان کا ایک فرد ہو گیا اور مفتی صاحب میرے خاندان کے، چنانچہ ایک مرتبہ اماں جی (مفتی صاحب کی والدہ محترمہ، جن کی وفات پر میں نے مہاجر میں ایک مضمون بھی لکھا تھا) نے مجھ سے فرمایا: میرے دو نہیں بلکہ تین بیٹے ہیں، عتیق، جلیل اور سعید۔ لیکن اس تمام بے تکلفی اور قربت کے باوجود مفتی صاحب اور میرے درمیان سن و سال اور مرتبہ و مقام کا جو فاصلہ تھا اس کو میں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ چنانچہ میں ان کو اپنا برابر بزرگ سمجھتا تھا اور وہ مجھ کو برابر خود جانتے تھے، لیکن ایسا برابر جو دوست بھی ہو، کسی نے ایک غفلت سے پوچھا: بھائی بہتر موتا ہے یا دوست؟ اس نے جواب دیا: وہ بھائی کس کام کا جو دوست نہ ہو اور میں دوست بھی تھا اور بھائی بھی، اس لئے یہ رشتہ بہت قوی تھا اور مضبوط بھی۔

میں ایک درس والدہ صاحبہ وغیرہ کے ساتھ محلہ ابو العالی میں رہا، پھر سب لوگ آگرہ چلے گئے تو میں بڑے بھائیوں کے محلہ میں ایک مکان میں رہنے لگا۔ اس کے

بعض نے مدرسہ کے اندر رہنے کا ارادہ کیا تو مدرسہ کے صدر دروازے کے اوپر جو ایک کمرہ بنا ہوا ہے اس میں حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی، جن کا شمار اکابر اساتذہ دارالعلوم میں ہوتا تھا رہتے تھے۔ اس کمرہ کی پھل میں ایک کمرہ ہے، والد صاحب قبلہ کی خواہش کے مطابق مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی نے میرے لئے یہ کمرہ تجویز کیا کہ میں ایک طرف خود ان کی خدمت میں جاؤں اور مولانا سراج احمد صاحب رشیدی کی براہ راست نگرانی میں رہوں، اس طرح بسلسلہ طالب علمی میرے قیام دارالعلوم کے تین دور ہیں، دور اول میں میں گوشہ نشین رہا۔ گھر سے مدرسہ اور مدرسہ سے گھر، بس یہ میری دنیا تھی، طلباء سے غلام بالکل نہیں تھا، البتہ جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں مفتی صاحب سے تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی، دور ثانی میں تعلقات کا حلقہ وسیع ہوا، میں نے طلباء کی انجمنوں کے جلسوں میں شرکت اور ان میں تقریر کرنا شروع کر دیا۔

اس سلسلہ میں ایک مرتبہ یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے ہاں ان کی بیٹیک میں روزانہ مغرب سے عشاء تک مجلس ہوتی تھی جس میں خالص علمی اور دینی گفتگو ہوتی تھی۔ وقتاً فوقتاً میں بھی اس مجلس میں شریک ہوتا تھا، ایک روز میں اور مفتی صاحب ہم دونوں اس مجلس میں حاضر ہوئے تو حضرت الاستاذ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: میاں سعید! تم تقریر کی مشق بھی کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! جمعیت محمدیہ کا جلسہ ہر جمعرات کو عشاء کے بعد ہوتا ہے، میں اس میں شریک ہو کر تقریر کرتا ہوں، مفتی صاحب کو بھانجی مارنے میں مزہ آتا تھا، فوراً بول پڑے، حضرت! یہ تقریر کیا کرتے ہیں، بس مولانا ابوالکلام آزاد کی کس تقریر کے ایک جن کو روٹ لیتے ہیں اور

اکتوبر ۱۹۸۳ء

میں اگر اسے اگل دیتے ہیں۔ حضرت الاستاذ نے یہ سنا تو بے ساختہ ہنس پڑے پھر فرمایا: شروع شروع میں یہ عادت بڑی نہیں، اچھی ہے، کیونکہ اس طرح ایک نامور ادیب و خلیف کے خاص خاص جملے اور الفاظ زبان زد ہو جاتے ہیں اور مقرر اپنی تقریر میں انھیں الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے اور اس طرح ایک دن وہ خود صاحب طرز اچھا مقرر بن جاتا ہے، لیکن یہ عادت مستقل ہرگز نہ ہونی چاہئے، یہ بات تو ختم ہو گئی، لیکن اس کے بعد حضرت الاستاذ نے جو حکیمانہ بات کہی وہ بھی سننے کے لائق ہے، ارشاد ہوا: ہاں میاں! تقریر کی مشق ضرور کیا کرو، یہ سمجھو کہ انسان کا سر ایک صندوق ہے اور زبان اس کی کنبی ہے، اب فرض کرو تمہارا پاس ایک صندوق ہے جو ہیرے جواہرات سے پُر ہے لیکن اگر صندوق کی کنبی تمہارے پاس نہیں ہے تو پھر صندوق کس کام کا؟ اس سے نہ خود تم فائدہ اٹھا سکتے ہو اور نہ کوئی دوسرا، ہاں اگر کنبی تمہارے قبضے میں ہے تو اب صندوق تمہارے لئے بھی کارآمد ہوگا اور دوسروں کے لئے بھی۔

اس زمانہ میں مفتی صاحب کے گھر آنا جانا بھی زیادہ ہو گیا تھا اور اس طرح مفتی صاحب کے ذاتی فضائل و کمالات اور خاص عادات و اطوار، جن کا ذکر تفصیل سے آگے آئے گا، ان کے مشاہدہ و معائنہ کا موقع تو مل ہی تھا، بڑی بات یہ ہوئی کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت بابرکت سے مستفید و مستفیض ہونے اور آپ کی نہایت سادہ اور بے تکلف مگناہتائی عارفانہ زندگی کے احوال و مشغول کے براہ راست اور قریبی مطالعہ کی سعادت نصیب ہونے لگی، حضرت مفتی صاحب کا روحانی رتبہ و مقام کیا تھا؟ اس کا اندازہ تو میرا ایسا عامی آدمی کیا کر سکتا ہے، البتہ جو بات میں اپنے علم و یقین کی روشنی میں جزم اور قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ فقر و رویشی جس کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے

بیماری

سرایہ فرمایا ہے، اس کا جو عالم میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی
ذلت اقدس میں دیکھا ہے وہ عرب و عجم میں کہیں نظر نہیں آیا، وہ دایا اعظم
دیوبند کے مفتی اعظم اور شیخ کمال تھے، ان کے شاگردوں اور پیروں اور
کاملہ بڑا وسیع تھا، پھر مدرسہ میں چراسی اور خدام بھی کم نہیں تھے، لیکن
بالآخر صبح کے وقت مدرسہ جانے سے پہلے گھر کا سودا سلف لینے خود بازار جاتے
تھے اور بازار جاتے وقت اس پاس کے گھروں کی عورتوں سے پوچھ لیتے تھے تاکہ
انہیں کچھ مگنا نہ ہو تو وہ بھی لیتے آئیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت و توجہات عالیہ سے میں نے
کیا کچھ حاصل کیا ہے اس کا ذکر آئندہ جستہ جستہ آتا رہے گا۔ یہاں ایک دلچسپ حوالہ
سنئے، ایک مرتبہ حضرت موصوف مفتی صاحب کو اوجھے ساتھ لے کر ایک بیل گلا
کے ذریعہ دیوبند سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں پہنچے اسی گاؤں
میں یہاں یا معتقد کے گھر قیام فرمایا، یہ مغرب سے خدا پہلے جھٹ پٹے کا وقت اور موسم
کے آغاز کا زمانہ تھا، عشاء کے بعد کھانا آیا تو وہ باجرے کی روٹی اور چنے کے
ساگ پر مشتمل تھا اور شاید کوئی چٹنی یا چار بھی اس کے ساتھ تھا، یہ دیکھتے ہی
مفتی صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گیا، ان میں ایک کمال یہ تھا کہ کیسا ہی کوئی مجمع ہو
کسی ناگوار سے ناگوار احساس کو ظاہر کئے بغیر نہ رہتے تھے مگر ذرا سکراتے ہو
آنکھوں کی ایک خاص مگردش اور معصومانہ لب و لہجہ کے ساتھ اس کا اظہار اس
بلیغ انداز میں کرتے تھے کہ وہ ایک لطیف طنز ہوتا تھا اور سامعین برا ماننے
بجائے اچانک ہنس پڑتے تھے، تو پھر بھلا اس موقع پر وہ جو کئے والے کہاں
بولے، اباجی! کیا تذکیہ نفس کی ایک شرط باجرے کی روٹی اور چنے کا سا
کھانا بھی ہے، حضرت مفتی صاحب کو ہنسی آگئی اور نرم اور دھیمی آواز میں فر

ان عتیق! کھانے کے تو دیکھو، کیا مزے کی چیز اور جانوروں کا تحفہ ہے، پھر حضرت
 نے سے مخاطب ہوئے اور پوچھا: تمہاری کیا رائے ہے! میں نے عرض کیا: حضرت!
 سبحان اللہ! یہ گرم گرم روٹی اور اس پر خالص چھڑا ہوا اور یہ ساگ خالص گھی
 بن بکھرا ہوا۔ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے، ہم شہر والوں کو یہ کہاں نصیب! حضرت
 مفتی صاحب یہ سن کر خوش ہوئے اور فرمایا: اصل مقام شکریہ ہی چیزیں ہیں
 ان کو عرف عام میں ادنیٰ اور معمولی سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ان چیزوں پر شکر کرنے میں
 نسا کا اپنے متعلق اعتراف، سچ میری بھی پایا جاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت نے ایک ایسی بات کہی کہ اسے سن کر کم از کم مجھے تو ایسا
 محسوس ہوا کہ گویا میرے دل پر ایک نشتر سالگ گیا، ارشاد ہوا: پوں تو میں
 امیروں اور دولت مندوں کے ہاں ان کے مکلف کھانے بھی کھاتا ہوں اور ان کو
 اللہ کی بڑی نعمت جان کر شکر ادا کرتا ہوں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ گھر کا سادہ کھانا
 کھانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب کے احساس سے قلب میں انشراح اور طمانیت
 کی جو کیفیت میں محسوس کرتا ہوں وہ مکلف کھانوں میں محسوس نہیں ہوتی، مفتی صاحب
 پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا؟ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ میں نے یہ دیکھا کہ انھوں نے
 دیہاتوں میں جانا عموماً ترک کر دیا تھا اور اگر کبھی حضرت مفتی صاحب نے ساتھ چلنے
 کو کہا بھی تو انھوں نے کہہ دیا: جلیل (قاری جلیل الرحمن صاحب، مفتی صاحب
 کے برادر خود) کو ساتھ لے جائیے، مجھ سے مٹی کے ڈھوبروں میں نہیں کھایا
 جاتا۔

ہاں تو ذکر میرے قیام دار العلوم کے دور ثانی کا ہو رہا تھا جب کہ میں بڑے بھائیوں
 نامی محلہ کے ایک مکان میں رہتا تھا جسے مردانہ مکان ہونے کی وجہ سے بیٹھک کہتے
 تھے، اس بیٹھک میں میرے ساتھ مفتی صاحب کے پھوپھا ڈپٹی محمد اشفاق صاحب کے

لے حرمہ دراز ہوا ماہنامہ جامعہ نئی دہلی میں، جب کہ اس کے ایڈیٹر مولانا اسلم جیلانی چوری تھے میں نے مرحوم پر ایک مضمون ”ارو کا ایک جہانِ رگ شام“ کے عنوان سے لکھا تھا۔ میں نے مرحوم کو نہیں دیکھا تھا، مفتی صاحب سے جو کچھ سنا تھا مقالہ کی بنیاد ہی تھا۔

اکتوبر ۱۹۹۹ء

۱۱

بہت گراں بہہ تعلق تھا، وہ اعلیٰ درجہ کے سخن سنج و سخن گو اور یہ اعلیٰ قسم کے سخن فرم
 سخن شناس، کوئی نئی قول یا نظم جب تک منقّص صاحب کو سنا کر اس کی داغ بیل لیتے
 تھے وہ اس کا اتنا شہسوار بن جاتے تھے کہ منقّص صاحب کا بیان ہے جب
 وہ قلم چمکتے تھے ایک سال بندہ جاتا تھا، منقّص صاحب کو ان کی غزلوں کی فہم
 یاد تھیں۔

اب منقّص صاحب کے ذوق شعروادب کا یہ پس منظر ذہن نشین کر کے سینہ ہماری
 اس مجلس میں گفتگو کا موضوع ضرور ادا ہو تا تھا، قاری اور دونوں کا
 کہیں قول اور نظیری پر تنقید ہوتی ہے اور کہیں غالب کے مشکل اشعار مثلاً:
 "ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خوں غلّی" یا قریٰ تغیر میں مفر ہے اک صوت غزالی کی
 وغیرہ وغیرہ، ان میں سے کوئی شعر لے لیا اور اس پر بحث شروع کر دی، منقّص صاحب
 ان گفتگوؤں میں ہمیشہ کچھ سے حصہ لیتے اور بڑی چمکی بات کہتے تھے جس سے ان
 کے مخصوص ادب افکار و نظریات کا علم ہوتا تھا۔ مثلاً قاری شاعری میں غزل کے اعتبار
 سے قرنی اور نظیری کو ایر خسرو سے بڑا شاعر مانتے تھے، کہتے تھے، خسرو میں
 قدرت کلام اور جزا است مگر بے پناہ ہے، لیکن سوز و گداز اور احساس درد و غم
 جو غزل کی جان ہے قرنی اور نظیری کے کلام میں خسرو سے زیادہ ہے، اسی طرح
 منقّص صاحب اردو شعراء میں غالب کی عظمت و مگر خیال اور اس کے تیسکے
 انداز بیان کے معترف تھے لیکن اس کے باوجود ان کے نزدیک غزل میں
 نوٹن کا رتبہ غالب سے اونچا تھا اور اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ
 نوٹن میں جو سوز و گداز اور خود پسندی ہے وہ غالب کے یہاں اس کی امانیت
 اور خود پسندی کی وجہ سے مفقود ہے اس سلسلے میں ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ
 دیکھتے غالب کا ایک شعر ہے:

جانا چڑا رقیب کے دہر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری نگذر کو میں
اس شعر میں کس درجہ انانیت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے خود کہا ہے:

سو پشت سے ہمیشہ آبار سپہ گری
اس کے بالمقابل اب تو من کا شعر دیکھئے۔ کہتے ہیں:

اس نقش پا کے سجدے نے کتنا کیا ذلیل
میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ان دونوں شعروں میں کتنا بڑا فرق ہے ارباب ذوق اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔
ایک مرتبہ مفتی صاحب نے اپنے خاص درد بھرے لہجے میں تو من کی یہ غزل سنائی
جس کے تین شعر مجھے اب تک یاد ہیں:

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
بے نالہ منہ سے گرتے ہیں بے گریہ اکھ سے اجزائے دل کا نہ حال نہ پوچھ اضطراب میں
پیہم سجدو پائے صنم پر دم و داغ تو من خدا کو بھول گئے اضطراب میں
ان شعروں کو سنانے کے بعد مفتی صاحب نے بڑی قوت سے کہا کہ غالب کے

پورے دیوان میں اس غزل کا کوئی جواب نہیں ہے۔ پھر ایک مرتبہ کہا کہ میں ہی
نہیں بلکہ خود غالب بھی تو من کے قائل تھے اسی وجہ سے توجب انھوں نے تو من کا یہ شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
سناتا تو غالب پھر ک اٹھے اور انھوں نے کہا کہ میں اس شعر کے بدلے میں اپنا پورا دیوان
دینے کے لئے تیار ہوں غرضیکہ ہماری اس مجلس میں اسی قسم کے ادبی مذاکے ہوتے
تھے اور مفتی صاحب اپنے بلند ذوق شعر و ادب کے چہرہ پر دکھاتے بہتے تھے جس سے
ہم لوگوں کو بہت فائدہ ہوا۔